ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY



AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1905

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: عربی ادب (عربی لٹریچر) (1905)

سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ نمبر 6 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی متعلقہ اکائیوں کا مطالعہ کریں اور اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں؛ کسی بھی تیار شدہ مواد کی ہو بہو نقل سے گریز کریں۔

سوال نمبر 1: سیرتِ رسول ﷺ کو ایمان کا لازمی تقاضا کیوں کہا گیا ہے؟ (20 نمبر)

سوال نمبر 1: سیرتِ رسول ﷺ کو ایمان کا لازمی تقاضا کیوں کہا گیا ہے؟

تعارف

ایمان محض چند عقائد کی ذہنی تصدیق کا نام نہیں بلکہ قلبی یقین، زبانی اقرار اور عملی اطاعت کا مجموعہ ہے۔ اس ایمان کا ایک بنیادی جز رسالت پر ایمان ہے اور رسالت پر ایمان کا لازمی نتیجہ سیرتِ رسول ﷺ کو جاننا، ماننا اور اپنانا ہے۔ اہل علم نے اسی لیے کہا ہے کہ سیرتِ رسول ایمان کا لازمی تقاضا ہے، یعنی ایمان کے بغیر سیرت کا شعور نامکمل اور سیرت کے بغیر ایمان کا دعویٰ ادھورا ہے۔ اس جواب میں ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں وہ اسباب بیان کریں گے جن کی بنا پر سیرت کو ایمان کا ناگزیر جز قرار دیا گیا ہے اور واضح کریں گے کہ دین کی فہم و عمل کے لیے شخصیتِ رسول کی مرکزی حیثیت کیوں ہے۔

رسالت پر ایمان کلمۂ ایمان کا دوسرا جز ہے

کلمۂ طیبہ کے دو جز ہیں: اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار۔ دوسرا جز اسی لیے رکھا گیا کہ اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ اور اس کے احکام کی ترسیل کا واسطہ رسول ہی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ پر ایمان اور رسول پر ایمان ایک ساتھ بیان ہوا: "اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ"۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا کہ جو اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرے اور بعض پر ایمان لا کر بعض کا انکار کرے وہ حقیقی کافر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول کو ماننا اللہ کو ماننے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ رسول اللہ ہی کا نمائندہ اور اس کے پیغام کا امین ہے۔ جب ایمانِ رسالت ثابت ہو گیا تو سیرت اسی ایمان کی تفصیل بن جاتی ہے، کیونکہ ہم رسول کی زندگی، اقوال و افعال اور کردار کو جانے بغیر رسالت کے مفہوم کو مجمل جملے سے آگے نہیں سمجھ سکتے۔ پس سیرت دراصل ایمان بالرسالت کی عملی تشریح ہے۔

قرآنی دلائل: اطاعت، اتباع اور اسوہ

قرآن مجید نے سیرت کو ایمان کا تقاضا کئی عنوانات سے ثابت کیا ہے۔ اولاً اطاعت کا حکم: "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اطاعت اسی کی ہو سکتی ہے جس کا طرزِ زندگی معلوم ہو، اور وہی سیرت ہے۔ ثانیاً اتباع کی شرط: سورۃ آل عمران میں فرمایا "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" یعنی اللہ سے محبت کا دعویٰ ہو تو رسول کی پیروی کرو، تب اللہ تم سے محبت کرے گا۔ ثالثاً اسوہ کا تصور: "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اس بات کا اعلان ہے کہ

رسول کی زندگی ایمان والوں کے لیے نمونہ ہے اور نمونہ اسی شے کو کہتے ہیں جس کی طرف دیکھ کر عمل سنوارا جائے۔ رابعاً فرمایا گیا: "وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا"۔ ان تمام آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ سیرت کا علم اور اس کی پیروی ایمان کے دعوے کی صداقت کا پیمانہ ہے، اختیاری زینت نہیں۔

سیرت قرآن کی عملی تفسیر ہے

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب نبی کریم ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ" یعنی آپ کا اخلاق (طریقِ زندگی) قرآن تھا۔ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے تمام احکام و آداب آپ ﷺ کی زندگی میں زندہ صورت میں نظر آتے ہیں۔ قرآن مجمل بات بھی کرتا ہے: نماز قائم کرنے کا حکم دیتا ہے مگر رکعات کی تعداد، اوقات کی عملی تفصیل اور طریقہ سیرت و سنت سے ملتا ہے؛ زکاۃ فرض کرتا ہے مگر نصاب و مقدار سیرت سے معلوم ہوتی ہے؛ حج کا حکم دیتا ہے مگر مناسک کی ترتیب آپ ﷺ کے عمل سے واضح ہوتی ہے۔ اسبابِ نزول، ناسخ و منسوخ کی پہچان اور آیات کے مصادیق کا علم بھی سیرت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ سیرت کو نظر انداز کر کے قرآن سمجھنے کی کوشش ایسی ہے جیسے نقشے کے بغیر عمارت بنائی جائے۔ اسی لیے مفسرین، محدثین اور فقہاء سب نے سیرت کو دین کی فہم کی بنیاد مانا ہے اور اسے ایمان کے تقاضوں میں شمار کیا ہے۔

محبتِ رسول ایمان کی شرط اور سیرت اس کا راستہ

احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے محبت کو ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے: "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" ظاہر ہے کہ محبت معرفت کے بغیر پیدا نہیں ہوتی، اور معرفت کا ذریعہ سیرت ہے۔ انسان جس کی زندگی کی تفصیلات جانتا ہے، اس کے احسانات، قربانیاں اور شفقتیں دیکھتا ہے، اسی سے محبت کرتا ہے۔ غزوات میں آپ ﷺ کی استقامت، طائف کی تکلیف میں صبر، فتح مکہ میں معافی، اہل و عیال کے ساتھ حسنِ سلوک، یتیموں اور کمزوروں پر شفقت — یہ سب سیرت کے وہ اوراق ہیں جو قاری کے دل میں عشقِ رسول پیدا کرتے

ہیں۔ یہ محبت پھر اتباع کا جذبہ بنتی ہے اور اتباع ہی ایمان کی روح ہے۔ اس لیے علماء لکھتے ہیں کہ سیرت کا مطالعہ عبادت بھی ہے اور ایمان کی تجدید بھی؛ ہر بار پڑھنے سے دل میں یقین تازہ ہوتا ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی

اسلام محض عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے، اور اس ضابطے کی عملی مثال سیرت میں ملتی ہے۔ گھریلو زندگی میں آپ ﷺ شوہر، والد اور نانا کی حیثیت سے نمونہ ہیں؛ معاشرتی زندگی میں پڑوسی، دوست اور شہری کی حیثیت سے؛ معاشی زندگی میں تاجر، مزدور کے حقوق کے محافظ اور کفایت شعار کی حیثیت سے؛ سیاسی و عسکری زندگی میں مدینہ کی ریاست کے سربراہ، معاہدوں کے پابند اور عدل و شوریٰ کے علمبردار کی حیثیت سے۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے لیے سیرت میں رہنمائی نہ ہو۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ مومن اپنی زندگی کے ہر شعبے کو دین کے مطابق ڈھالے، اور یہ ڈھلاؤ سیرت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے چودہ صدیوں میں سیرت کو سب سے زیادہ لکھا جانے والا موضوع بنایا اور ہر دور کے مصلحین نے تجدیدِ ایمان کے لیے سیرت ہی سے استفادہ کیا۔

سیرت سے بے نیازی کے نتائج

اس کے برعکس سیرت سے بے نیازی کے نتائج بھی تاریخ میں ظاہر ہیں۔ جب امت سیرت سے دور ہوئی تو دین محض رسموں کا مجموعہ بن گیا، قرآن کی تلاوت باقی رہی مگر اس کا عملی نمونہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، اختلافات میں شدت آ گئی کیونکہ مشترکہ عملی مرجع کمزور پڑ گیا اور ایمان کا دعویٰ لسانی حد تک محدود ہو گیا۔ بدعات بھی اسی خلا میں پیدا ہوتی ہیں جہاں سیرت کا معیار موجود نہ ہو۔ اس کے بالمقابل جن ادوار میں سیرت کا مطالعہ عام ہوا، وہاں اخلاق و کردار کی بحالی، دعوت کی قوت اور اجتماعی اعتماد کی فضا پیدا ہوئی۔ اس تاریخی مشاہدے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ سیرت محض معلوماتی کتاب نہیں بلکہ ایمان کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہے؛ یہی وجہ ہے کہ کہا گیا سیرت ایمان کا لازمی تقاضا ہے، کیونکہ ایمان اپنی بقا و ترقی کے لیے سیرت کا محتاج ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ سیرتِ رسول ﷺ کو ایمان کا لازمی تقاضا اس لیے کہا گیا ہے کہ: کلمۂ ایمان کا دوسرا جز رسالت ہے اور سیرت اسی رسالت کی تفصیل ہے؛ قرآن نے اطاعت واتباعِ رسول کو ایمان کی شرط اور آپ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے؛ قرآن کی عملی تفسیر اور مجمل احکام کی تفصیل سیرت ہی سے ملتی ہے؛ محبتِ رسول جو ایمان کی شرط ہے، سیرت کی معرفت کے بغیر پیدا نہیں ہوتی؛ اور زندگی کے تمام شعبوں کی رہنمائی کا مکمل نمونہ سیرتِ طیبہ ہے۔ پس جو ایمان سیرت سے خالی ہو وہ دعویٰ ہے اور جو سیرت ایمان سے خالی ہو وہ محض تاریخ؛ دونوں کا اجتماع ہی حقیقی دین ہے۔

سوال نمبر 2: عربی زبان میں اعراب کے نظام کا معنی کی وضاحت میں کردار (20 نمبر)

سوال نمبر 2: عربی زبان میں اعراب کا نظام معنی کی وضاحت میں کیا کردار ادا کرتا ہے؟

تعارف

عربی زبان کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک اس کا نظامِ اعراب ہے۔ اعراب سے مراد کلمے کے آخر میں آنے والی وہ حرکات یا علامات ہیں جو جملے میں اس کلمے کے نحوی مقام کو ظاہر کرتی ہیں، یعنی یہ بتاتی ہیں کہ یہ لفظ فاعل ہے یا مفعول، مضاف ہے یا مضاف الیہ، مبتدا ہے یا خبر۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں معنی کی وضاحت کے لیے الفاظ کی ترتیب پر انحصار کیا جاتا ہے، جب کہ عربی میں اعراب یہ ذمہ داری خود ادا کرتا ہے۔ یہی نظام عربی کو اختصار، وسعتِ ترتیب اور دقتِ معنی کی بے مثال صلاحیت عطا کرتا ہے۔ اس جواب میں اعراب کی اقسام کا تعارف کرایا جائے گا اور پھر مثالوں، خصوصاً قرآنی مثالوں، سے واضح کیا جائے گا کہ معنی کی وضاحت میں اس کا کردار کس قدر فیصلہ کن ہے۔

اعراب کی تعریف اور اقسام

لغت میں اعراب کے معنی ہیں واضح کرنا اور فصاحت سے بیان کرنا، اور اصطلاح میں بھی اس کا کام یہی ہے: معنی کو کھول کر بیان کرنا۔ نحوی اعتبار سے کلمے کی تین بڑی حالتیں ہیں: رفع، نصب اور جر، اور فعل مضارع میں چوتھی حالت، جزم بھی آتی ہے۔ رفع کی علامت عموماً ضمہ، نصب کی فتحہ اور جر کی کسرہ ہے، مگر تثنیہ، جمع مذکر سالم اور اسماءِ خمسہ وغیرہ میں یہ علامات الف، یاء اور واؤ وغیرہ سے بدلتی ہیں، انہیں فرعی علامات کہتے ہیں۔ بعض کلمات "مبنی" ہوتے ہیں جن کا آخر ہر حال میں ایک رہتا ہے، ان کا اعراب تقدیری یا محلی ہوتا ہے۔ اس نظام کی خوبصورتی یہ ہے کہ سننے والا لفظ کے آخری آواز سے ہی سمجھ جاتا ہے کہ جملے میں اس کا کام کیا ہے، اور اسی سے پورے جملے کا مفہوم یکدم روشن ہو جاتا ہے۔

پہلا کردار: فاعل و مفعول کی تمیز

اعراب کا سب سے بنیادی کردار فاعل و مفعول کی تمیز ہے۔ جملہ "ضَرَبَ زَيْدٌ عَمْرًا" میں زید پر ضمہ نے اسے فاعل اور عمرو پر فتحہ نے اسے مفعول بنا دیا؛ اگر اعراب بدل دیں "ضَرَبَ زَيْدًا عَمْرٌو" تو معنی الٹ جاتا ہے، اب مارنے والا عمرو اور مار کھانے والا زید ہے، حالانکہ الفاظ اور ان کی ترتیب بالکل وہی ہے۔ یہ ایک مثال پورے نظام کی طاقت ظاہر کر دیتی ہے کہ عربی میں معنی کا فیصلہ ترتیب نہیں، اعراب کرتا ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے عربی میں تقدیم و تاخیر کی وسیع آزادی ہے: تاکید یا حصر کے لیے مفعول کو فاعل سے پہلے لا سکتے ہیں جیسے "إِيَّاكَ نَعْبُدُ" میں مفعول کو مقدم کر کے حصر کا معنی پیدا کیا گیا، مگر اعراب موجود ہونے سے مفہوم میں کوئی ابہام پیدا نہیں ہوتا۔ اگر اعراب نہ ہوتا تو ہر زبان کی طرح عربی کو بھی جامد ترتیب کا پابند ہونا پڑتا اور اس کی بلاغی لچک ختم ہو جاتی۔

قرآنی مثالیں: اعراب سے معنی کا عظیم فرق

قرآن مجید میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں اعراب کی معمولی تبدیلی سے معنی میں بڑا فرق پڑتا ہے اور فقہ و تفسیر کی بڑی بحثیں اسی سے پیدا ہوئی ہیں۔ ذیل کی جدول تین مشہور مثالیں پیش کرتی ہے:

جدول: قرآنی مثالوں میں اعراب اور معنی کا تعلق

آیت	اعرابی نکتہ	معنی پر اثر
"اَنَّ اللّٰہَ بَرِیۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَرَسُوۡلُہٗ" (التوبہ: 3)	"رسولہ" پر ضمہ (رفع)	رسول بھی مشرکین سے بری ہے، کیونکہ وہ "بریء" کی خبر پر معطوف ہے؛ اگر جر پڑھا جائے تو معنی یہ بنے گا کہ اللہ رسول سے بری ہے، جو محال ہے۔
"اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا" (فاطر: 28)	"اللہ" منصوب (مفعول) اور "العلماء" مرفوع (فاعل)	ثابت ہوا کہ اللہ سے ڈرنے والے علماء ہیں؛ اعراب بدلے جائے تو فاعل و مفعول میں ابہام پیدا ہو جائے۔
"وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ وَاَرۡجُلِکُمۡ / اَرۡجُلِکُمۡ" (المائدہ: 6)	"ارجل" کا نصب بمقابلہ جر (دو قراءتیں)	نصب پر [illegible] ہونے اور جر پر مسح کے قریب ہونے کی فقہی بحث پیدا ہوئی، جس سے وضو کے مسائل میں ائمہ کے مؤقف بنے۔

متن کی تشریح کے بعد کا مرحلہ: صفت، اضافت اور دیگر تراکیب

جدول کی مثالوں کے علاوہ اعراب روزمرہ کی ترکیبوں میں بھی معنی سنوارتا ہے۔ "جَاءَنِي غُلَامُ زَيْدٍ" میں اضافت سے ملکیت و نسبت واضح ہوتی ہے، جب کہ "جَاءَنِي غُلَامٌ زَيْدًا" ناقابلِ فہم ہو گا۔ صفت و موصوف کی مطابقت اعراب ہی سے ظاہر ہوتی ہے: "رَأَيْتُ رَجُلًا كَرِيمًا" میں کریما کا نصب بتاتا ہے کہ یہ رجلاً کی صفت ہے، فعل کی نہیں۔ ضمیر کا مرجع، حال و تمیز کا مقام، نفی و استثنا کا دائرہ — سب فیصلے اعراب کرتا ہے۔ عربی شاعری میں بھی یہی نظام ہے کہ قلبِ ترتیب کے باوجود مفہوم قائم رہتا ہے اور وزن و قافیے کی

رعایت ممکن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لغت پڑھنے والا طالب علم اگر اعراب سے واقف نہ ہو تو الفاظ جانتے ہوئے بھی متن کا مفہوم غلط سمجھ بیٹھتا ہے، اور ترجمے کی بہت سی غلطیاں درحقیقت اعراب کی غلطیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

اعراب کی حفاظت کی تاریخی کوشش اور نحو کی تدوین

اعراب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کی پہلی صدی ہی میں اس کی حفاظت کے لیے باقاعدہ علمِ نحو کی بنیاد رکھ دی گئی۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت میں "رسولہ" کو جر سے پڑھ دیا، جس سے معنی فاسد ہو گیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایما پر ابوالاسود الدؤلی نے نحو کے اصول مرتب کرنے کا آغاز کیا اور قرآن پر نقطے و حرکات کا نظام رائج ہوا۔ بعد ازاں خلیل بن احمد فراہیدی اور سیبویہ نے اس علم کو کمال تک پہنچایا۔ یہ تاریخی واقعہ بتاتا ہے کہ امت نے اعراب کو محض لسانی مہارت نہیں سمجھا بلکہ قرآن کے مفہوم کی حفاظت کا ذریعہ سمجھا؛ کیونکہ اعراب سلامت رہے تو مفہوم سلامت رہے گا۔ آج بھی مدارس و جامعات میں قرآنی اعراب کی تعلیم اسی شعور کے تحت دی جاتی ہے اور علمِ قراءات میں اعرابی اختلافات کی حفاظت اس نظام کی عظمت کا ثبوت ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اعراب عربی زبان کا وہ نظام ہے جو کلمے کی نحوی حیثیت ظاہر کر کے جملے کے معنی کو واضح، محفوظ اور بے ابہام بناتا ہے۔ یہ فاعل و مفعول کی تمیز کرتا ہے، ترکیبوں کے تعلق کو کھولتا ہے، تقدیم و تاخیر کی بلاغی آزادی دیتا ہے اور قرآن و شاعری کے مفاہیم کو بگاڑ سے بچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی سیکھنے کا اصل دروازہ اعراب کی سمجھ ہے؛ اعراب کے بغیر عربی عبارت محض الفاظ کا ڈھیر ہے اور اعراب کے ساتھ وہ شفاف معنی کی حامل زندہ زبان ہے۔

سوال نمبر 3: صحرائی زندگی نے عربی شاعری کے اسلوب کو کیسے تشکیل دیا؟ (20 نمبر)

سوال نمبر 3: صحرائی زندگی نے عربی شاعری کے اسلوب کو کیسے تشکیل دیا؟

تعارف

جاہلی دور کی عربی شاعری کو ادب کی تاریخ میں معجزۂ بیان قرار دیا جاتا ہے۔ اس شاعری کا اسلوب کسی درس گاہ یا ادبی اکیڈمی کی پیداوار نہیں تھا بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے صحرا، اس کی سخت زندگی، قبائلی نظام اور فطری ماحول نے اسے صدیوں میں تراشا تھا۔ جغرافیہ اور ادب کا تعلق یہاں اتنا گہرا ہے کہ معلقات پڑھنے والا قاری صحرا کو صرف پس منظر نہیں بلکہ شاعری کا مرکزی کردار پاتا ہے۔ اس جواب میں ہم یہ دیکھیں گے کہ صحرائی زندگی نے عربی شاعری کے موضوعات، زبان و لفظیات، تشبیہات، ساخت اور لہجے کو کس طرح تشکیل دیا اور یہ اسلوب بعد کے ادوار پر کیسے اثر انداز ہوا۔

موضوعات کی تشکیل: سفر، کوچ اور اطلال

صحرائی زندگی کی پہلی جھلک شاعری کے موضوعات میں ملتی ہے۔ صحرا میں زندگی رواں دواں تھی: پانی اور چراگاہ کی تلاش میں قبیلے موسم کے ساتھ کوچ کرتے تھے۔ اسی کوچ کا منظر قصیدے کا افتتاح بن گیا: محبوبہ کے قبیلے کا کوچ (ظعن) شاعر کے دل کی دنیا کو اجاڑ دیتا اور وہ خالی پڑے ہوئے ٹھکانوں (اطلال) پر کھڑا ہو کر روتا اور ماضی کو یاد کرتا۔ اسے "الوقوف علی الأطلال" کہتے ہیں اور تقریباً ہر جاہلی قصیدہ اسی سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرا بڑا موضوع سفر (رحلہ) ہے: لمبے صحرائی سفر میں اونٹنی شاعر کی واحد ساتھی و سواری تھی، اس لیے قصیدے کے درمیانی حصے میں اونٹنی کا مفصل وصف ازبس ناگزیر سمجھا گیا۔ طرفہ بن العبد نے اپنے معلقے میں اونٹنی کے ایک ایک عضو کا اتنا دقیق بیان کیا ہے کہ گویا حیوانیات کا باب ہو۔ تیسرا بڑا موضوع قبائلی زندگی سے آیا: فخر و حماسہ، مدح و ہجا، جنگوں کے واقعات (ایام العرب) اور مہمان نوازی و سخاوت کی ستائش۔ یہ سب موضوعات کتابی نہیں، صحرا کی کوکھ سے پیدا شدہ ہیں۔

زبان و لفظیات پر اثر: جزالت، فصاحت اور نادر الفاظ

صحرائی ماحول نے شاعری کی زبان کو بھی خاص رنگ دیا۔ بدوی زندگی کی سختی زبان میں جزالت پیدا کرتی ہے، یعنی الفاظ گاڑھے، بھرپور اور پر زور ہوتے ہیں۔ شاعر کے پاس صحرا کی ہر شے کے لیے بے شمار مترادفات موجود تھے: تلوار، شیر، اونٹ، بارش اور گھوڑے کے لیے سینکڑوں الفاظ، جن سے اس کی لغت کی دولت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ

دولت اس لیے پیدا ہوئی کہ بدوی کی زندگی کا انحصار اپنے ماحول کے دقیق مشاہدے پر تھا؛ بارش کی اقسام، ہواؤں کے رخ، ستاروں کی پوزیشن اور جانوروں کی عادات کو نام دینا اس کی بقا کا مسئلہ تھا۔ شاعری میں اسی مشاہدے کی بدولت نادر اور دقیق الفاظ کی بھرمار ملتی ہے جسے شارحین نے بعد میں لغت و نحو کے شواہد کے طور پر جمع کیا۔ ساتھ ہی یہ زبان حد درجہ فصیح تھی، کیونکہ قبائل کے اجتماعات اور سوق عکاظ جیسے میلوں میں شاعر کو ہزاروں سامعین کے سامنے اپنی فصاحت منوانی پڑتی تھی؛ کمزور لفظ فوراً پکڑا جاتا تھا۔

تشبیہات و استعارات کا صحرائی ماخذ

جاہلی شاعری کی تصویری دنیا کلیتاً صحرا سے ماخوذ ہے۔ شاعر اپنے گھوڑے کو پہاڑ سے لڑھکنے والے سیلابی پتھر سے تشبیہ دیتا ہے (امرؤالقیس کے مشہور اشعار اسی قبیل سے ہیں)، محبوبہ کی گردن کو ہرنی سے، اس کے حسن کو طلوع ہوتے سورج سے، تلوار کی چمک کو بجلی سے اور سخاوت کو برسات سے مشبہ قرار دیتا ہے۔ رات کی طوالت کو وہ ستاروں کے بندھے ہونے سے، مصیبت کو اونٹ کے بیٹھنے اور اٹھنے سے اور زمانے کے حوادث کو وحشی جانوروں کے حملوں سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس موازن و مشبہ کی فراہمی کے لیے صرف یہی منظر نامہ موجود تھا۔ اس حد بندی نے نقصان کے بجائے کمال پیدا کیا: تشبیہیں مشاہدے کی سچائی لیے ہوئے ہیں، مصنوعی پن سے خالی ہیں اور سننے والے کے ذہن میں فوراً تصویر کھینچ دیتی ہیں۔ ادب کے نقاد اسے عربی شاعری کی "حسیت" کہتے ہیں، یعنی تجرید کے بجائے محسوسات کے ذریعے بات کرنا، اور یہ وصف بھی صحرا کی دین ہے۔

قصیدے کی ساخت اور لہجے کی تشکیل

صحرائی سفر نے قصیدے کو اس کی مخصوص ساخت دی: نسیب (محبوبہ کا ذکر و اطلال پر وقوف)، رحلہ (سفر و سواری کا بیان) اور پھر غرضِ اصلی یعنی مدح، فخر یا ہجا۔ یہ تین مراحل دراصل ایک حقیقی صحرائی سفر کے مراحل ہیں: ماضی کی یاد سے آغاز، حال کی مشقت کا سفر، اور منزل پر قبیلے کے سامنے اپنی بات رکھنا۔ لہجے کے اعتبار سے یہ شاعری خطابی ہے؛ شاعر قبیلے کا ترجمان ہوتا تھا، اس لیے اسلوب میں بلا کا اعتماد، صدا کی گونج اور جمعِ غفیر کو مخاطب کرنے کی شان ہے۔ قافیہ و بحر کی پابندی بھی اسی اجتماعی سماعت کی

ضرورت سے مضبوط ہوئی، تاکہ اشعار حفظ ہو کر قبیلے سے قبیلے تک پہنچیں۔ در حقیقت صحرا میں شاعر کی حیثیت آج کے ذرائع ابلاغ جیسی تھی: جنگ کا اعلان، صلح کا پیغام، قبیلے کی تاریخ اور اعزاز، سب اس کے اشعار میں محفوظ رہتے تھے؛ اس لیے اس کا اسلوب بھی عوامی، یادگار اور پُراثر ہونا ناگزیر تھا۔

ایجاز، ضرب الامثال اور حقیقت پسندی

صحرائی زندگی کی ایک اور دین اسلوب کا ایجاز اور ضرب المثل سازی ہے۔ سخت زندگی میں وقت اور توانائی کی قلت نے کم لفظوں میں بڑی بات کہنے کی عادت ڈالی؛ شاعروں کے مصرعے بعد میں ضرب المثل بن گئے اور روزمرہ گفتگو میں استعمال ہونے لگے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کے حکیمانہ اشعار اس کی مثال ہیں جن میں جنگ سے نفرت اور صلح کی ترغیب اختصار کے ساتھ بیان ہوئی۔ ساتھ ہی اس شاعری میں حقیقت پسندی نمایاں ہے: شاعر جو دیکھتا ہے، وہی کہتا ہے۔ مہمات کی تفصیل، زخموں کی کیفیت، پیاس کی شدت اور موت کی سچائی کو چھپاتا نہیں۔ مبالغہ بھی موجود ہے مگر اس کا پیمانہ بھی فطرت کے مشاہدے سے باہر کم ہی نکلتا ہے۔ یہی خصوصیات مل کر اس اسلوب کو "واقعیت پسند فصاحت" کا نمونہ بناتی ہیں جو بعد کی صدیوں میں اسلامی تہذیب کی شاعری کی بنیاد بنا؛ عباسی دور کے شعراء نے شہری موضوعات تو اپنائے مگر بیان و معیار جاہلی قصیدہ ہی رہا اور شعر کی سند کی حیثیت اسی بدوی اسلوب سے قائم رہی۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ صحرائی زندگی نے عربی شاعری کے اسلوب کو ہر سطح پر تشکیل دیا: موضوعات میں اطلال، کوچ، سفر، اونٹ اور قبائلی مفاخر دیے؛ زبان میں جزالت، فصاحت اور الفاظ کی بے پناہ دولت بخشی؛ تشبیہات کو صحرائی مشاہدات سے مادی و محسوس بنایا؛ قصیدے کو نسیب، رحلہ اور غرض کی ساختی ترتیب دی؛ اور لہجے کو خطابی اعتماد، ایجاز اور حقیقت پسندی سے آراستہ کیا۔ عربی شاعری کا یہ اسلوب فطرت کی آغوش میں پروان چڑھا اور یہی اس کا سب سے بڑا سحر ہے کہ اس میں صحرا بستا ہے اور صحرا اس میں زندہ ہے۔

سوال نمبر 4: عربی نشاۃِ ثانیہ (النہضۃ) کے عربی زبان و ادب پر اثرات (20 نمبر)

سوال نمبر 4: عربی نشاۃِ ثانیہ (النہضۃ) نے عربی زبان و ادب پر کیا اثرات مرتب کیے؟ وضاحت کریں۔

تعارف

انیسویں صدی عیسوی میں عرب دنیا میں ایک فکری و ادبی بیداری پیدا ہوئی جسے "النہضہ"، یعنی نشاۃِ ثانیہ یا عصرِ نو زائیدگی کہا جاتا ہے۔ صدیوں کے جمود کے بعد نپولین کے حملۂ مصر (1798ء)، محمد علی پاشا کی اصلاحات، مطابع خانوں کے قیام، مغربی علوم کے تراجم اور یورپ سے رابطے نے عرب معاشرے میں نئی حرکت پیدا کر دی۔ شام و لبنان کے مسیحی اہلِ قلم، مصر کے دانشور اور مہاجر ادباء نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ اس تحریک نے عربی زبان اور اس کے ادب دونوں کو بنیادی طور پر بدل کر رکھ دیا: زبان کی تجدید بھی ہوئی اور ادب میں نئی اصناف، نئے موضوعات اور نئی فکر داخل ہوئی۔ اس جواب میں دونوں شعبوں کے اثرات کو الگ الگ واضح کیا جائے گا۔

زبان پر اثرات: نثر کی سادگی، صحافتی اسلوب اور جدید اصطلاحات

نہضہ کا سب سے پہلا اثر عربی نثر پر پڑا۔ قرونِ وسطیٰ کی نثر مسجع، بوجھل اور آرائش و قافیہ بندی میں الجھی ہوئی تھی؛ نہضہ کے اہلِ قلم جیسے رفاعہ رافع الطہطاوی، بطرس البستانی اور ناصیف الیازجی نے سادہ، صاف اور مقصد آفریں نثر کو رواج دیا۔ صحافت نے اس تبدیلی کو تیز کر دیا: اخبار کو روزانہ ہزاروں قارئین تک بات پہنچانی ہوتی ہے، اس لیے لکھی جانے والی زبان صاف اور فوری فہم ہونے لگی۔ دوسرا بڑا اثر اصطلاحات سازی کا ہے؛ جدید سائنس، ٹیکنالوجی، سیاست اور معیشت کے ہزاروں مفاہیم کے لیے عربی میں نئے الفاظ گڑھے یا ترجمہ و اشتقاق سے بنائے گئے، جن میں ٹیلی فون کے لیے "ھاتف"، ریل کے لیے "قطار"، اخبار کے لیے "صحیفہ" و "جریدہ" جیسے الفاظ آج فصحیٰ کا حصہ ہیں۔ تیسرا اثر لغت نویسی اور علمی تصانیف کا ہے: بطرس البستانی کی لغت "محیط المحیط" اور دائرۃ المعارف، پھر "المنجد" جیسی کتابوں نے جدید عربی کو منظم کیا۔ چوتھا اثر فصحیٰ کی ترویج اور عامیہ (مقامی بولیوں) کے مسئلے پر بحث کا آغاز ہے، جس نے زبان کی وحدت پر علمی گفتگو کا دروازہ کھولا اور پھر دمشق و قاہرہ میں مجامعِ لغویہ (اکیڈمیاں) قائم ہوئیں جو آج تک اصطلاحات کی منظوری دیتی ہیں۔

ترجمہ تحریک اور تعلیم کا کردار

نہضہ کی بنیاد میں ترجمہ تحریک سب سے اہم تھی۔ محمد علی کے دور میں "مدرسۃ الألسن" قائم ہوئی اور الطہطاوی کی نگرانی میں سینکڑوں یورپی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں؛ شام میں مشنری اداروں اور سائنسی جرائد "المقتطف" و "الھلال" نے جدید علم عام کیا۔ ترجمے نے عربی نثر کو بیانِ واقعات، تاریخی سوانح، سیاسی مضامین اور سائنسی موضوعات کے قابل بنایا، جس نے زبان کے دائرۂ اظہار کو حیرت انگیز وسعت دی۔ ساتھ ہی طباعت پھیل گئی: بولاق کا سرکاری مطبع، اخبارات "الوقائع المصریہ"، "الاہرام"، "المقتطف" اور ہزاروں کتابوں نے پڑھنے والے طبقے کو وسیع کر دیا۔ تعلیمِ نسواں اور اسکولوں کے پھیلاؤ نے عربی کتاب کا قاری عام آدمی تک پہنچا دیا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اب صرف علما و دربار کی زبان نہ رہی بلکہ عوامی اظہار اور جدید علوم کا ذریعہ بن گئی، اور اس کی یہی عوامی زندگی بعد کی تمام ادبی تبدیلیوں کی زمین بنی۔

ادب پر اثرات: نئی اصناف کی پیدائش

نہضہ نے عربی ادب کا نقشہ بدل دیا۔ نثر میں ناول پیدا ہوا: جرجی زیدان کے تاریخی ناولوں نے لاکھوں قاری بنائے اور بالآخر محمد حسین ہیکل کے ناول "زینب" (1913ء) کو پہلا باقاعدہ عربی ناول قرار دیا گیا۔ قصہ کہانی، افسانہ، مضمون و مقالہ، سوانح عمری اور ڈرامہ (مسرحیہ) — احمد فارس الشدیاق، مارون النقاش اور ابو خلیل القبانی جیسے ناموں کے ساتھ تھیٹر نے جنم لیا۔ ادبی تنقید جدید معنوں میں ابھری: طہ حسین، عباس محمود العقاد اور محمد مندور نے پرانے معیاروں پر سوالات اٹھائے اور مغربی تنقیدی اصول متعارف کرائے۔ موضوعات بھی بدل گئے: قومی آزادی، سماجی اصلاح، عورت کی تعلیم، غلامی و جاگیرداری پر تنقید، سائنس و عقلیت کی قدردانی اور مشرق و مغرب کا موازنہ ادب کا مرکز بن گئے۔ مصطفی لطفی المنفلوطی نے جذبات سے لبریز اسلوب سے نوجوان نسل کو ادب کا دیوانہ بنا دیا، یعنی ادب عشرت کدے سے نکل کر سماجی شعور کا ترجمان بن گیا۔

شاعری پر اثرات: کلاسیکی بحالی اور جدت کی بنیاد

شاعری میں نہضہ نے دو مرحلے پیدا کیے۔ پہلا "احیاء" کا مرحلہ تھا جس میں محمود سامی البارودی نے جاہلی و عباسی قصیدے کی شان و فصاحت کو دوبارہ زندہ کیا اور تکلف و کمزوری کا دور ختم کیا۔ دوسرا مرحلہ تجدید کا تھا: احمد شوقی نے قصیدے کو نئے موضوعات، تاریخی تمثیلوں اور ڈرامائی نظموں کی طرف لے جا کر "امیر الشعراء" کا لقب پایا؛ حافظ ابراہیم

نے عوامی و قومی مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا؛ خلیل مطران نے ذاتی جذبات و فطرت نگاری سے رومانوی شاعری کی بنیاد رکھی۔ مہاجر (امریکا میں مقیم عرب) شعراء جیسے جبران خلیل جبران، میخائل نعیمہ اور ایلیا ابو ماضی نے نظم و نثر میں آزادی، سادگی اور انسانیت نوازی کا نیا رنگ دیا اور "نثری نظم" یعنی شعر منثور کو متعارف کرایا۔ ان تجربات نے اگلی نسل کے لیے آزاد نظم (شعر حر) کی راہ ہموار کی جو بیسویں صدی کے وسط میں نازک الملائکہ اور بدر شاکر السیاب کے ہاتھوں پوری صنف بن گئی۔ یوں نہضہ نے شاعری کو محض روایت کی پاسداری سے نکال کر تجربے کے میدان میں اتار دیا۔

جدول: نشاۃِ ثانیہ کے اثرات کا خلاصہ

شعبہ	تبدیلی	نمایاں نام / مثال
نثر	مسجع و بوجھل اسلوب سے سادہ، صحافتی و مقصدی نثر	طہطاوی، بستانی؛ اخبارات الاہرام، المقتطف
لفظیات	جدید اصطلاحات کی تشکیل و ترجمہ	ھاتف۔دھ؛ مجامع لغویہ
نثری اصناف	ناول، افسانہ، ڈرامہ، مضمون، تنقید کا آغاز	جرجی زیدان؛ ہیکل کا ناول "زینب"
شاعری	قصیدے کی بحالی کے بعد موضوعاتی و ہیئتی تجدید	بارودی، شوقی، حافظ ابراہیم، مطران
اشاعت و تعلیم	مطابع، اخبارات، اسکول؛ قاری طبقے کی توسیع	بولاق پریس، مدرسۃ الألسن

تنقیدی جائزہ

نہضہ کے اثرات کا جائزہ متوازن انداز میں لینا چاہیے۔ ایک طرف اس نے مردہ دلوں میں زندگی دوڑائی، زبان کو جدید علم کے قابل بنایا اور ادب کو عوام سے جوڑ دیا۔ دوسری طرف بعض حلقوں نے مغرب کی حد سے بڑھی تقلید، فصحیٰ کو کمزور کرنے والی عامیہ پسند تجاویز اور کلاسیکی ورثے سے بیزاری پر تنقید بھی کی۔ تاہم مجموعی طور پر اہلِ نظر اس بات پر متفق ہیں کہ نہضہ کے بغیر جدید عربی ادب کا تصور ناممکن تھا: آج کا عربی اخبار، ناول، تنقیدی مضمون اور جدید نظم سب اسی تحریک کی اولاد ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ نہضہ

نے عربی کو اس کے عالمگیر کردار کی طرف واپس موڑا، کیونکہ بیسویں صدی میں یہی زبان افریقا و ایشیا کے کروڑوں انسانوں کی علمی و سیاسی زبان بنی اور اس کے ادب نے نوبیل انعام (نجیب محفوظ) تک رسائی پائی۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ عربی نشاۃِ ثانیہ نے زبان کو سادہ نثر، جدید اصطلاحات، جدید ویسی، صحافت اور فصحیٰ کی تنظیم عطا کی، اور ادب کو ناول، ڈرامہ، افسانہ، مضمون، جدید تنقید اور تجدید یافتہ شاعری جیسی اصناف و موضوعات سے مالامال کر دیا۔ یہ تحریک محض ادبی واقعہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی احیاء تھا جس نے زبان و ادب کو ان کے روایتی خول سے نکال کر جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا اور آج کی عربی دنیا کی فکری ساخت کی بنیاد رکھ دی۔

سوال نمبر 5: حافظ ابراہیم نے عربی زبان کے زوال کا نوحہ کس انداز میں کیا؟ (20 نمبر)

سوال نمبر 5: حافظ ابراہیم نے عربی زبان کے زوال کا نوحہ کس انداز میں کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

تعارف

مصر کے عظیم شاعر حافظ ابراہیم (1872ء–1932ء) کو "شاعر النیل" کہا جاتا ہے۔ وہ نہضہ کے دور کے ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے قومی و ملی مسائل کو شاعری کا مرکزی موضوع بنایا۔ ان کی سب سے مشہور نظموں میں وہ نظم شامل ہے جس میں انہوں نے عربی زبان کے زوال پر نوحہ کہا ہے۔ اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاعر خود نہیں بولتا بلکہ عربی زبان خود ایک زندہ شخصیت بن کر اپنی زبوں حالی کا شکوہ کرتی ہے۔ یہ نظم آج بھی عربی زبان کی حفاظت کی تحریکوں کا نعرہ ہے اور اس کے اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔ اس جواب میں نظم کے پس منظر کو بیان کر کے اس کے انداز کی خصوصیات اشعار کے حوالے سے واضح کی جائیں گی۔

پس منظر: استعماری دور میں زبان کا بحران

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں عربی زبان کئی طرف دباؤ میں تھی۔ مصر و شام پر انگریزی و فرانسیسی تسلط کے نتیجے میں سرکاری و تعلیمی میدان میں یورپی زبانوں کو فوقیت حاصل ہو رہی تھی؛ بعض مشنری و ملکی آوازیں یہ تجویز بھی دے رہی تھیں کہ فصحیٰ کو چھوڑ کر عامیہ (مقامی بولیاں) اپنائی جائیں، یا عربی رسم الخط کو لاطینی حروف سے بدل دیا جائے۔ اس سے بڑھ کر دکھ کی بات یہ تھی کہ خود اہلِ عرب اپنی زبان سے بے پروا ہو گئے تھے: نوجوان نسل فصحیٰ کو "مشکل اور فرسودہ" سمجھنے لگی تھی اور اسے دورِ جدید کے علوم کے لیے ناقابل قرار دیا جا رہا تھا۔ اس ماحول میں حافظ ابراہیم نے قلم اٹھایا۔ ان کا نوحہ دراصل ایک فکری جواب تھا: انہوں نے زبان کی کمزوری کا الزام زبان پر نہیں، اس کے بولنے والوں پر لگایا اور زبان کو اپنی عظمت بیان کرنے کا موقع دیا۔

مرکزی تکنیک: زبان کی تشخص اور خود کلامی

نظم کے انداز کی سب سے نمایاں خصوصیت "تشخص" ہے، یعنی زبان کو ماں، داعی اور شاکی کی صورت میں ایک زندہ ہستی بنا کر پیش کرنا۔ نظم کا آغاز زبان کی اپنی زبان سے ہوتا ہے: "رَجَعْتُ لِنَفْسِي فَاتَّهَمْتُ حَصَاتِي ۝ وَنَادَيْتُ قَوْمِي فَاحْتَسَبْتُ حَيَاتِي" یعنی میں نے اپنے نفس کی طرف رجوع کیا اور اپنی ہی کنکریوں (اہلِ زبان) کو ملامت کیا، اور اپنی قوم کو پکارا مگر اپنی زندگی اللہ کے حوالے کر دی۔ اس اسلوب کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کسی لیکچر کو نہیں سنتا بلکہ ایک زخمی ماں کی فریاد سنتا ہے، اور فریاد دل پر وہ اثر کرتی ہے جو دلیل نہیں کر سکتی۔ زبان مزید کہتی ہے کہ میرے اہل نے نوجوانی ہی میں مجھ پر بانجھ ہونے کا الزام لگا دیا: "رَمَوْنِي بِعُقْمٍ فِي الشَّبَابِ وَلَيْتَنِي ۝ عَقِمْتُ فَلَمْ أَجْزَعْ لِقَوْلِ عُدَاتِي" یعنی انہوں نے مجھے جوانی میں بانجھ ہونے کا طعنہ دیا؛ کاش میں بانجھ ہی ہوتی تو دشمنوں کی بات پر تڑپتی نہ۔ اس طعنے کا مفہوم یہ ہے کہ نئی نسل زبان کو جدید مفاہیم کے اظہار کے نااہل کہتی ہے، حالانکہ قصور زبان کا نہیں، اس نسل کی کم ہمتی کا ہے۔

احتجاج واستدلال: شکوے میں منطق کا انداز

حافظ ابراہیم کا نوحہ محض رونے دھونے کا نام نہیں؛ اس میں ایک پختہ منطقی احتجاج بھی ہے جو نوحے کو فکری وزن دیتا ہے۔ زبان اپنی صفائی میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتی ہے: "وَسِعْتُ كِتَابَ اللهِ لَفْظًا وَغَايَةً ۝ وَمَا ضِقْتُ عَنْ آيٍ بِهِ وَعِظَاتِ" یعنی میں نے اللہ کی کتاب کو الفاظ اور مقاصد دونوں اعتبار سے اپنے اندر سمو لیا اور اس کی آیات و نصیحتوں کے لیے کبھی تنگ نہ ہوئی۔ پھر سوال کرتی ہے: "فَكَيْفَ اَضِيْقُ الْيَوْمَ عَنْ وَصْفِ اٰلَةٍ ۝ وَتَنْسِيْقِ اَسْمَآءٍ لِّمُخْتَرَعَاتِ" یعنی جو زبان کلامِ الٰہی جیسے عظیم ترین متن کے لیے کافی تھی، وہ آج کسی آلے کی توصیف یا نئی اختراعات کے نام رکھنے سے کیسے تنگ پڑ سکتی ہے؟ یہ استدلال استعماری ذہنیت کا براہ راست رد ہے: جو زبان قرآن و حدیث، فقہ و فلسفہ اور صدیوں کے علم کو اٹھائے ہوئے ہے، اسے ناقابل کہنے والے دراصل اپنی استعداد کی کوتاہی کو زبان کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔ اس طرح نوحہ ماتم کے ساتھ مقدمہ بھی ہے، اور اس دوہری کیفیت نے اسے عام مرثیے سے الگ کر دیا ہے۔

انداز کی دیگر خصوصیات: ملامت، امید اور کلاسیکی ہیئت

اس نوحے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ملامت کا نشانہ دشمن نہیں بلکہ اپنے ہیں۔ زبان اپنے بیٹوں کو "عقوق" یعنی نافرمانی و ناشکری کا طعنہ دیتی ہے، جیسے ماں بگڑے ہوئے بیٹوں کو ڈانٹتی ہے۔ یہ انداز اصلاحی ہے، کیونکہ بیرونی دشمن کو گالیاں دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا، اصل علاج اہلِ زبان کی بیداری ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ نوحے میں مایوسی کا غلبہ نہیں؛ زبان اپنے ماضی کی شان یاد دلا کر مستقبل کی امید بھی جگاتی ہے کہ جس نے ہر دور میں علم و تہذیب کی قیادت کی، وہ آج بھی اہلِ ہمت پائے تو اٹھ کھڑی ہو سکتی ہے۔ پانچویں خصوصیت ہیئت و اسلوب کی ہے: حافظ ابراہیم نے جدید قومی پیغام کو کلاسیکی قصیدے کی بحر و قافیہ اور جاہلی و عباسی دور کی فصاحت میں ڈھالا، تاکہ بذاتِ خود نظم کی زبان اس کے دعوے کا ثبوت بن جائے کہ عربی آج بھی اعلیٰ ترین اظہار کی قوت رکھتی ہے۔ جذبات کی سچائی، مفاہیم کی وضاحت اور لہجے کی نرمی و جلال کا یہ امتزاج اس نظم کو نہضہ دور کی شاعری کا شاہکار بناتا ہے۔

نظم کے اثرات واہمیت

اس نظم کا اثر محض ادبی حلقوں تک محدود نہیں رہا۔ عربی زبان کے علمی و عوامی حلقوں میں یہ نظم زبان کی ناموس کا اعلان بن گئی؛ اس کے اشعار خطبوں، مضامین اور زبان کے عالمی دن کی تقریبات میں آج بھی اقتباس کیے جاتے ہیں۔ اس نے اہلِ عرب کو یہ شعور دیا کہ زبان کی زندگی اس کے بولنے والوں کی غیرت سے وابستہ ہے، اور اسی شعور نے آگے چل کر مجامعِ لغویہ کی کوششوں، تعریب (اصطلاحات سازی) کی تحریک اور فصحیٰ کی تدریس کی اصلاح کو تقویت دی۔ حافظ ابراہیم کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک قومی مسئلے کو اس قدر ذاتی، جذباتی اور جمالیاتی انداز میں پیش کیا کہ قاری زبان کے دفاع کو اپنا ذاتی فریضہ سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اس نظم کو عربی زبان پر لکھی گئی تمام منظومات میں سب سے مقبول مقام حاصل ہے اور ان کا نام زبان کے محافظ شاعر کے طور پر زندہ ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حافظ ابراہیم نے عربی زبان کے زوال کا نوحہ ایک منفرد انداز میں کیا ہے: زبان کو زندہ ماں کی صورت میں بولنے والا بنا کر اس کا شکوہ پیش کیا، شکوے کو جذبات کے ساتھ منطقی استدلال سے آراستہ کیا جس کا مرکز قرآن کو سمانے والی زبان کی وسعت کا ثبوت ہے، ملامت کا رخ دشمن کے بجائے اہلِ زبان کی بے توجہی کی طرف رکھا، اور مایوسی کے بجائے امید و بیداری کا پیغام دے کر نوحے کو تحریک میں بدل دیا۔ کلاسیکی ہیئت میں جدید قومی درد کی یہ پیش کش نہضہ دور کی عربی شاعری کی نمایاں ترین مثالوں میں سے ہے۔